میں تحریف شمار کی جائیں گی نہ کہ اجتہاد۔

طلاق یا فسخ نکاح یا تفریق کے وقوع کے لیے اس جدید قانون میں جو صورتیں رکھی گئی ہیں، وہ سب فسخ و تفریق کے معاملہ میں تو ایک حد تک صحیح ہیں لیکن طلاق کے معاملہ میں قطعاً غلط ہیں۔

سود کے متعلق چند اہم مباحث

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کا سوالنامہ اور اس کا جواب

[پچھلے دنوں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور نے ایک مجلسِ مذاکرہ منعقد کی تھی جس میں سود کے متعلق چند اہم سوالات زیرِ بحث لائے گئے تھے۔ اس غرض کے لیے ادارہ نے ایک سوال نامہ مرتب کیا تھا جو زیرِ بحث مسائل پر مشتمل تھا۔ ان سوالات کا جو جواب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے دیا وہ یہاں درج کیا جاتا ہے]

سوالنامہ ۱۔ عرب میں پیغمبرِ اسلام صلعم کے زمانہ میں قرضہ لینے دینے کی شکل کیا تھی؟

۲۔ لفظ "ربوٰ" کے معنی۔

۳۔ "ربوٰ" اور "ربح" میں فرق۔

۴۔ ربوٰ میں قرض دینے والا شرائط مقرر کرتا ہے اور بنک انٹرسٹ میں قرض لینے والا پیش کرتا ہے۔

۵۔ بیع سَلَم اور کمرشل انٹرسٹ میں کیا فرق ہے۔ ایک شخص ایک بھینس جو روزانہ دس سیر دودھ دیتی ہے، دوسرے کو دیتا ہے اور کہتا ہے کہ بھئی اس کے

وعدہ میں سے پانچ سیر ہمیں دے دیا کرو۔ یہ جائز ہے تو پھر اس میں اور منافع پر روپیہ قرض دینے میں کیا فرق ہے؟

۶۔ ہم جنس کا تبادلہ ہم جنس سے تفاضل کے ساتھ کیوں ناجائز ہے جبکہ غیر ہم جنس کے ساتھ تفاضل جائز ہے؟

۷۔ تجارت میں طرفین کی رضامندی لازمی ہے یا نہیں؟ بعض کے نزدیک تراضیٔ طرفین کی عدم موجودگی ہی ربوٰ کو پیدا کرتی ہے۔ نقصان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیا حرمتِ ربوٰ کی یہی بنیاد تھی کہ اس میں ایک پارٹی پر ظلم ہوتا ہے؟ کمرشل انٹرسٹ میں کسی پارٹی پر بھی ظلم نہیں ہوتا۔ اگر یہ درست ہے کہ کسی پارٹی پر ظلم نہیں ہوتا تو بنک انٹرسٹ ربوٰ کے تحت کیسے آسکتا ہے؟

۸۔ (ا) صنعتی اداروں کے معمولی حصے۔

(ب) ان کے ترجیحی حصے۔

(ج) بنکوں کا فکسڈ ڈیپازٹ

(د) بنکوں سے لیٹر آف کریڈٹ کھولنا۔ اس کے مختلف پہلو۔ اگر لیٹر آف کریڈٹ کی بنا پر تجارت کے لیے قرض لینا ناجائز ہے تو اس کے لیے جائز صورت کیا ہوگی جس سے نظامِ تجارت میں خلل نہ پڑے؟

(ہ) ہاؤس بلڈنگ، فنانس کارپوریشن اور انڈسٹریل فنانس کارپوریشن۔

(و) گورنمنٹ کے قرضے (۱) اپنے ملک سے (۲) غیر ملکوں سے۔ اگر یہ تمام قرضے ناجائز ہیں تو پھر گورنمنٹ کی مشینری چلانے کے لیے کیا تجاویز ہو سکتی ہیں؟

جوابات:

پہلا سوال پہلے سوال میں دراصل تنقیح طلب امور یہ ہیں: (۱) نزولِ قرآن کے زمانہ میں تجارتی

صنعتی، زراعتی اور ریاستی اغراض کے لیے قرض کے لین دین کا دنیا میں عام رواج تھا یا نہیں؟ (۲) ان قرضوں پر سود لگایا جاتا تھا یا نہیں؟ (۳) اہلِ عرب میں یہ بات پوری طرح معروف تھی یا نہیں کہ ان اغراض کے لیے بھی قرض کا لین دین ہوتا ہے؟ اور (۴) اس نوعیت کے قرضوں پر اصل سے زائد جو کچھ وصول کیا جاتا تھا اس کے لیے ربٰوہی کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی یا لغت عرب میں اس کے لیے کوئی دوسرا لفظ مستعمل تھا؟

ان تنقیحات پر کلام کرنے سے پہلے ہمیں قبل اسلام کے عرب کی معاشی تاریخ اور بیرونی دنیا سے اس کے تعلقات پر ایک نگاہ ڈال لینی چاہیے تاکہ یہ غلط فہمی نہ رہے کہ عرب دنیا سے الگ تھلگ پڑا ہوا ایک ملک تھا جس کے باشندے اپنی وادیوں اور صحراؤں سے باہر کی دنیا کو کچھ نہ جانتے تھے۔

زمانہ قدیم کی تاریخ سے متعلق جو مواد آج دنیا میں موجود ہے۔ اس سے یہ بات پوری طرح ثابت ہے کہ اس زمانے میں چین، ہندوستان اور دوسرے مشرقی ممالک کی اور اسی طرح مشرقی افریقہ کی جتنی تجارت بھی مصر، شام، ایشیائے کوچک، یونان اور روم کے ساتھ ہوتی تھی وہ سب عرب کے واسطے سے ہوتی تھی۔ اس تجارت کے تین بڑے راستے تھے۔ ایک ایران سے خشکی کا راستہ جو عراق اور شام ہوتا ہوا جاتا تھا۔ دوسرا خلیج فارس کا بحری راستہ جس سے تمام تجارتی سامان عرب کے مشرقی سواحل پر اترتا اور دومۃ الجندل یا تدمر (PALMYRA) ہوتا ہوا آگے جاتا تھا۔ تیسرا بحر ہند کا راستہ جس سے آنے جانے والے تمام اموالِ تجارت حضر موت اور یمن سے گزرتے تھے۔ یہ تینوں راستے وہ تھے جن پر عرب آباد تھے۔ عرب خود بھی ایک طرف سے مال خرید کر لے جاتے اور دوسری طرف اسے فروخت کرتے تھے۔ حمل و نقل کا کاروبار (CARRYING TRADE) بھی کرتے تھے۔ اور اپنے علاقے سے گزرنے والے قافلوں سے بھاری ٹیکس لیکر انہیں بحفاظت گزارنے کا ذمہ بھی لیتے تھے۔ ان تینوں صورتوں سے ہمیشہ بین الاقوامی

تجارت کے ساتھ ان کا گہرا تعلق رہا۔ ۲۰۰۰ برس قبل مسیح سے یمن اور مصر کے تجارتی تعلقات کا صاف ثبوت ملتا ہے۔ ۱۰۰۰ برس قبل مسیح میں بنی اسماعیل کے تجارتی قافلوں کی سرگرمیوں پر توراۃ شہادت دیتی ہے۔ شمالی حجاز میں مَدیَن (مِدیان) اور دِدان (DEDAN) کی تجارت ڈیڑھ ہزار برس قبل مسیح اور اس کے بعد کئی صدی تک چلتی نظر آتی ہے۔ حضرت سلیمانؑ و داؤدؑ کے زمانے (ایک ہزار سال قبل مسیح) سے یمن کے سبائی قبائل اور ان کے بعد حِمیَری قبیلے ابتدائی مسیحی صدیوں تک مسلسل تجارتی نقل و حرکت کرتے رہے ہیں۔ مسیح علیہ السلام سے لگ بھگ زمانے میں فلسطین کے یہودی عرب آکر یثرب، خیبر، وادی القریٰ (موجودہ العُلاء)، تیما اور تبوک میں آباد ہوئے اور ان کے دائمی تعلقات، مذہبی اور ثقافتی بھی اور تجارتی بھی، شام و فلسطین اور مصر کے یہودیوں کے ساتھ برقرار رہے۔ عرب میں شام اور مصر سے غلہ اور شراب درآمد کرنے کا کام زیادہ تر یہودی کرتے تھے۔ پانچویں صدی سے قریش نے عرب کی بیرونی تجارت میں غالب حصہ لینا شروع کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد تک ایک طرف یمن اور حبش سے، دوسری طرف عراق سے اور تیسری طرف مصر و شام سے ان کے نہایت وسیع تجارتی تعلقات تھے۔ مشرقی عرب میں ایران کی جتنی تجارت یمن کے ساتھ تھی اس کا بہت بڑا حصہ حِیرہ سے یمامہ (موجودہ ریاض) اور پھر بنی تمیم کے علاقے سے گزرتا ہوا نجران اور یمن جاتا تھا۔ صدہا برس کے ان وسیع تجارتی روابط کی موجودگی میں یہ فرض کرنا بالکل خلاف عقل ہے کہ بیرونی دنیا کے ان ممالک میں جو مالی معاملات اور کاروباری طریقے مروج تھے ان کی عرب کے لوگوں کو خبر نہ ہو۔

ان تجارتی تعلقات کے علاوہ سیاسی اور ثقافتی اعتبار سے بھی عرب کے لوگوں کا اپنے گردوپیش کی مہذب دنیا سے گہرا ربطہ تھا۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں شمالی حجاز کے مقام تیما کو بابل کے بادشاہ نیبو نیدوس (NABONIDUS) نے اپنا گرمائی دارالسلطنت بنایا تھا۔ کیسے ممکن تھا کہ بابل میں جو معاشی قوانین اور طریقے رائج تھے ان سے حجاز کے لوگ بے خبر رہ گئے ہوں۔ تیسری صدی قبل مسیح سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد تک پہلے

پطرا (PETRA) کی نبطی ریاست، پھر تدمر کی شامی ریاست، اور اس کے بعد حیرہ اور غسان کی عربی ریاستیں عراق سے مصر کے حدود تک اور حجاز و نجد کے حدود سے الجزیرہ اور شام کے حدود تک مسلسل قائم رہیں۔ ان ریاستوں کا ایک طرف یونان و روم سے، اور دوسری طرف ایران سے نہایت گہرا سیاسی، تمدنی، تہذیبی، اور معاشی تعلق رہا ہے پھر نسلی رشتوں کی بنا پر اندرون عرب کے قبائل بھی ان کے ساتھ وسیع تعلقات رکھتے تھے۔ مدینہ کے انصار اور شام کے غسانی فرمانروا ایک ہی نسل سے تھے اور ان کے درمیان پیہم تعلقات قائم رہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں خود آپ کے خاص شاعر حضرت حسان بن ثابت غسانی امراء کے ہاں آتے جاتے تھے۔ حیرہ کے امراء سے قریش والوں کا بہت میل جول تھا، حتیٰ کہ قریش کے لوگوں نے لکھنا پڑھنا بھی انہی سے سیکھا اور حیرہ ہی سے وہ رسم الخط انہیں ملا جو بعد میں خط کوفی کے نام سے مشہور ہوا۔ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ ان تعلقات کے ہوتے یہ لوگ یونان و روم اور مصر و شام اور عراق و ایران کے مالی و معاشی معاملات سے بالکل ناواقف رہ گئے ہوں

مزید براں عرب کے ہر حصے میں شیوخ، اشراف، اور بڑے بڑے تاجروں کے پاس رومی، یونانی اور ایرانی لونڈیوں اور غلاموں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ ایران و روم کی لڑائیوں میں دونوں طرف کے جو جنگی قیدی غلام بنائے جاتے تھے، ان میں سے زائد از ضرورت تعداد کو کھلے بازار میں فروخت کر دیا جاتا تھا، اور عرب اس مال کی بڑی منڈیوں میں سے ایک تھا۔ ان غلاموں میں اچھے خاصے پڑھے لکھے مہذب لوگ بھی ہوتے تھے اور صنعت پیشہ اور تجارت پیشہ لوگ بھی۔ عرب کے شیوخ اور تجار ان سے بہت کام لیتے تھے۔ مکہ، طائف، یثرب اور دوسرے مرکزوں میں ان کی ایک بڑی تعداد موجود تھی اور یہ کاریگروں کی حیثیت سے، یا تجارتی کارکنوں کی حیثیت سے اپنے آقاؤں کی قیمتی خدمات بجا لاتے تھے۔ آخر یہ کس طرح ممکن تھا کہ اپنے ان مددگاروں کے ذریعہ سے کسی عرب تاجر کے کان میں کبھی یہ بات نہ پڑی ہو کہ گردوپیش کی دنیا میں مالی و کاروباری معاملات کے کیا طریقے رائج ہیں۔

اس کے ساتھ عرب کی معاشی تاریخ کا ایک اور پہلو بھی نگاہ میں رہنا چاہیے۔ عرب کسی زمانہ میں بھی نہ تو خوراک کے معاملہ میں خود کفیل رہا ہے، اور نہ وہاں ایسی صنعتوں کو فروغ نصیب ہوا ہے جن سے تمام ضرورت کے سامان ملک ہی میں فراہم ہو جاتے ہوں۔ اس ملک میں ہمیشہ اشیائے خوردنی بھی باہر سے درآمد ہوتی رہی ہیں اور ہر طرح کی مصنوعات بھی حتیٰ کہ پہننے کے کپڑے تک زیادہ تر باہر ہی سے آتے رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب کے عہد میں یہ درآمدی تجارت زیادہ تر دو گروہوں کے ہاتھ میں تھی۔ ایک قریش اور ثقیف۔ دوسرے یہود۔ لیکن یہ لوگ مال درآمد کر کے صرف تھوک فروشی ہی کرتے تھے۔ اندرون ملک کی چھوٹی چھوٹی بستیوں اور قبائلی ٹھکانوں میں خردہ فروشی کرنا ان کا کام نہ تھا، نہ ہو سکتا تھا اور نہ قبائل اس بات کو کبھی گوارا کر سکتے تھے کہ سارے تجارتی فائدے یہی لوگ لوٹ لے جائیں اور ان کے اپنے آدمیوں کو اس اجارہ داری میں گھسنے کا کسی طرف سے راستہ نہ ملے۔ اس لیے تھوک فروش کی حیثیت سے یہ لوگ اندرونِ ملک کے خردہ فروش تاجروں کے ہاتھ لاکھوں روپے کا مال فروخت کرتے تھے، اور اس کا ایک معتد بہ حصہ اُدھار فروخت ہوتا تھا۔ شاید دنیا میں تھوک فروش اور خردہ فروش کے درمیان کبھی اور کہیں خالص نقد لین دین کا طریقہ رائج نہیں رہا ہے۔ اس لین دین میں اُدھار بالکل ناگزیر ہے جس سے کبھی مفر نہ تھا۔ اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ صرف عرب ہی میں اس وقت یہ لین دین بالکل نقداً نقد کی شرط پر ہوتا تھا اور قرض کا اس میں کوئی دخل نہ تھا، تو عقلاً بھی یہ قابلِ قبول نہیں ہے، اور تاریخی طور پر بھی یہ غلط ہے، جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا۔

اب میں ان تنقیحات کو لیتا ہوں جن کا ذکر میں نے آغاز میں کیا تھا۔

یہ امر کہ قدیم زمانے میں قرض صرف ذاتی و شخصی ضرورتوں ہی کے لیے نہیں لیا جاتا تھا بلکہ تجارتی، صنعتی، اور زراعتی اغراض کے لیے بھی اس کا عام رواج تھا اور حکومتیں بھی اپنی ریاستی اغراض کے لیے قرض لیتی تھیں، تاریخ سے بالکل ثابت ہے اور یہ دعویٰ کرنے کے

لیے کوئی بنیاد نہیں ہے کہ پرانی دنیا میں قرض کا لین دین صرف شخصی حاجتوں کے لیے ہوتا تھا۔ اسی طرح یہ بھی ثابت ہے کہ قرض پر اصل سے زائد ایک طے شدہ مقدارِ مال لینے کا طریقہ، شخصی اور کاروباری معاملات کے درمیان کسی قسم کا امتیاز کیے بغیر ہر قسم کے قرضوں کی صورت میں رائج تھا۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۴۶ء) کے مضمون (BANKS) میں بیان کیا گیا ہے کہ بابل اور مصر کے مندر صرف عبادت گاہ ہی نہ تھے بلکہ بینک بھی تھے۔ بابل کے آثار قدیمہ میں جو گِلی تختیاں (CLAY TABLETS) ملی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ زمیندار فصل سے پہلے اپنی زرعی ضروریات کے لیے مندروں سے قرضے لیتے تھے اور فصل کاٹنے کے بعد مع سُود یہ قرض ادا کرتے تھے۔ یہ ساہوکاری نظام دو ہزار برس قبل مسیح میں پایا جاتا تھا۔ چھٹی صدی قبل مسیح کے لگ بھگ زمانے میں پرائیویٹ بینک بھی بابل میں کام کرتے پائے جاتے ہیں۔ ۵۷۵ ق م میں بابل کے (IGIBI BANK) کا وجود ملتا ہے جو زمینداروں کو زرعی اغراض کے لیے قرض دیتا تھا۔ نیز یہ بینک لوگوں کے ڈپازٹ اپنے پاس رکھ کر ان پر سود ادا بھی کرتا تھا۔

(یاد رہے کہ یہ وہی زمانہ تھا جب شمالی حجاز کا شہر تیما بابل کی سلطنت کا گرمائی دار السلطنت تھا)

وِل ڈیورانٹ اپنی کتاب (A STORY OF CIVILIZATION) میں بابل کے متعلق لکھتا ہے:

"ملک میں از روئے قانون ۲۰ فی صدی نقد روپے کے قرضوں پر، اور ۳۳ فی صدی سالانہ اجناس کی صورت میں قرضوں پر سُود مقرر تھا۔ بعض طاقتور خاندان نسلاً بعد نسلٍ ساہوکارے کا کام کرتے اور صنعت پیشہ لوگوں کو سُود پر قرضے دیتے تھے۔ ان کے علاوہ مندروں کے پروہت فصلوں کی تیاری کے سبب

زمینداروں کو قرض دیا کرتے تھے۔"

اس سلسلے میں آگے چل کر یہی مصنف لکھتا ہے:

"ایک وبا کی طرح پھیلی ہوئی سود خواری وہ قیمت تھی جو ہماری صنعت کی طرح بابل کی صنعت بھی ایک پیچیدہ نظام قرض کے ذریعہ سے سیراب ہونے کے بدلہ میں ادا کر رہی تھی۔ بابل کا تمدن اصلاً ایک تجارتی تمدن تھا۔ جتنی دستاویزیں بھی اس کے آثار سے اس زمانہ میں برآمد ہوئی ہیں وہ زیادہ تر کاروباری نوعیت کی بیع فروخت، قرضے، ٹھیکے، شرکت، دلالی، مبادلہ، اقرارنامے، تمسکات، اور اسی طرح کے دوسرے امور[1]۔"

اسیریا کی حالت بھی اس سے مختلف نہ تھی۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں سیناکریب کے زمانے کا حال بیان کرتے ہوئے ول ڈورانٹ لکھتا ہے:

"صنعت اور تجارت کو ایک حد تک نجی کاروبار کرنے والے ساہوکار سرمایہ فراہم کر کے دیتے اور ان قرضوں پر ۲۵ فی صدی سالانہ سود وصول کرتے تھے[2]۔"

یونان کے متعلق انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مضمون (BANKS) میں بیان کیا گیا ہے کہ چوتھی صدی قبل مسیح سے وہاں بینک کاری کے باقاعدہ نظام کا ثبوت ملتا ہے۔ اس نظام میں ایک قسم کے بینک وہ تھے جو لوگوں کے مال بطور امانت اپنے پاس رکھتے تھے اور اس پر سود دیتے تھے۔

ول ڈورانٹ لکھتا ہے کہ پانچویں صدی قبل مسیح میں ڈیلفی کا اپالو مندر تمام یونانی دنیا کا بین الاقوامی بینک تھا۔ اس سے اشخاص کو بھی اور ریاستوں کو بھی معتدل شرح سود پر قرضے حاصل ہوتے تھے۔ اسی طرح پرائیویٹ صراف ۱۲ سے ۳۰ فی صدی تک شرح سود پر تاجروں کو قرضے دیتے تھے۔ یونانیوں نے یہ طریقے مشرق قریب (بابل و مصر اور شام) سے سیکھے اور بعد میں روم نے ان

---

[1] جلد اول ص ۲۲۸-۲۲۹ [2] جلد اول، ص ۲۷۴۔

طریقوں کو یونان سے سیکھا۔ پانچویں صدی کے آخر میں بعض بڑے بڑے پرائیویٹ بینک یونان میں قائم ہو چکے تھے۔ انہی کے ذریعہ سے ایتھنز کی تجارت پھیلنی شروع ہوئی[1]۔

اس کے بعد روم کا دور آتا ہے۔ وِل ڈورانٹ لکھتا ہے کہ دوسری صدی قبل مسیح میں روم کی بینک کاری پورے عروج پر تھی۔ ساہوکار لوگوں کے ڈپازٹ رکھتے تھے اور ان پر سود ادا کرتے تھے۔ قرض لیتے بھی تھے اور دیتے بھی تھے۔ کاروبار میں اپنا روپیہ بھی لگاتے تھے اور دوسروں کا بھی لگواتے تھے[2]۔ پہلی صدی عیسوی میں رومی سلطنت کے ہر حصے میں بینک قائم ہو چکے تھے۔ بینک کاری کے دوسرے کاموں کے ساتھ یہ لوگوں کے ڈپازٹ رکھ کر سود دیتے اور آگے روپیہ قرض دے کر سود وصول کرتے تھے۔ یہ کاروبار زیادہ تر یونانیوں اور شامیوں کے ہاتھ میں تھا۔ گال (GAUL) میں تو شامی اور ساہوکار دونوں ہم معنی لفظ ہو گئے تھے۔ اس زمانہ میں سرکاری خزانہ بھی زمینداروں کو فصل کی کفالت پر سودی قرضے دیتا تھا۔ آگسٹس کے زمانہ میں شرح سود ۴ فی صدی تک گر گئی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد شرح ۶ فی صدی تک اور قسطنطین کے زمانہ میں ۱۲ فی صدی تک چڑھ گئی[3]۔

اسی پہلی صدی عیسوی کے متعلق بیرن (BARON) اپنی کتاب (A RELIGIOUS AND SOCIAL HISTORY OF THE JEWS) میں بیان کرتا ہے کہ اسکندریہ کے یہودی بینکرز الیگزینڈر اور ڈیمیٹریس نے یہودیہ کے بادشاہ اگریپا اول کو دو لاکھ درہم (تقریباً ۴۰ ہزار ڈالر) قرض دیئے تھے[4]۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بالکل قریب کے زمانہ میں قیصر روم جسٹینین نے (جس کی وفات آنحضرت کی پیدائش سے صرف پانچ برس قبل ہوئی تھی)، تمام بیزنطینی سلطنت میں اندر جو سے قانون زمینداروں اور کاشتکاروں کے قرضوں پر ۴ فی صدی، شخصی قرضوں پر ۶ فی صدی، تجارتی

---

[1] جلد اول، ص ۶۳-۲۶۲۔ [2] جلد سوم، ص ۸۸۔

[3] جلد سوم، ص ۳۶-۳۳۱ [4] جلد اول ص ۲۶۱

اور صنعتی قرضوں پر ۸ فی صدی، اور بحری تجارت کے قرضوں پر ۱۲ فی صدی شرح سود مقرر کی تھی۔ یہ قانون جسٹینین کے بعد بھی ایک مدت تک بیزنطینی سلطنت میں رائج رہا[1]۔ یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیے کہ جس بیزنطینی سلطنت میں سود کا یہ قانون رائج تھا اس کی سرحدیں شمالی حجاز سے ملی ہوئی تھیں، شام، فلسطین اور مصر کے تمام علاقے اس کے زیرنگین تھے۔ قریش کے تاجر ان علاقوں کی منڈیوں میں پیہم آمد و رفت رکھتے تھے۔ اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم بچپن سے آغاز نبوت تک مسلسل تجارتی قافلوں کے ساتھ ان منڈیوں میں جاتے رہتے تھے۔ آخر یہ بات کیسے فرض کی جا سکتی ہے کہ قریش کے ان تاجروں کو اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان بازاروں میں کاروبار کرتے ہوئے کبھی یہ پتہ نہ چلا کہ بیزنطینی سلطنت میں تجارت، صنعت اور زراعت کی اغراض کے لیے بھی قرض کے لین دین کا رواج ہے اور اس پر از روئے قانون سود کی شرحیں مقرر ہیں؟

عین زمانہ نبوت میں روم اور ایران کے درمیان وہ زبردست لڑائی ہو رہی تھی جس کا ذکر قرآن مجید کی سورۂ روم میں کیا گیا ہے۔ اس لڑائی میں جب ہرقل نے خسرو پرویز کے مقابلہ پر جوابی جنگ کا آغاز کیا، اس وقت اپنی جنگی ضروریات کے لیے اسے کلیساؤں کی جمع شدہ دولت سود پر قرض لینی پڑی تھی[2]۔ اب کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ جس عظیم الشان لڑائی نے عراق سے مصر تک عرب کے سارے بالائی حصے کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا، جس میں ایران کی زبردست فتوحات کے ہر طرف چرچے ہو رہے تھے، اور جس میں سلطنت روم کے گرتے ہوئے قصر کو بچانے کے بعد اب قیصر نے یکایک خسرو کے مقابلے پر وہ حیرت انگیز پیش قدمی کی تھی جو ساسانی دارالسلطنت، مدائن کی تباہی پر جا کر ختم ہوئی، اس لڑائی کا یہ واقعہ عرب کے لوگوں سے بالکل پوشیدہ رہ گیا ہوگا کہ قیصر نے اپنی اس پیش قدمی کے لیے سرمایہ

[1] ول ڈورانٹ، جلد چہارم، ص ۱۲۰ و ۴۲۶۔ گبن، زوال و سقوط دولت روم، ج ۲۔ ص ۷۱۶۔

[2] CAMBRIDGE ECONOMIC HISTORY OF EUROPE, V.2, P 90
GIBBON, DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE, V.2 P791

کلیساؤں سے سود پر حاصل کیا ہے ؟ مجوسیوں سے عیسائیت کو بچانے اور بیت المقدس ہی کو نہیں مقدس صلیب کو بھی مشرکین کے قبضے سے نکالنے کے لیے جنگ کی جاتے، اور کلیسا کے پادری اس کارِ خیر کے لیے سود پر قرض دیں، یہ عجیب و غریب واقعہ آخر ان لوگوں کے علم میں آنے سے کیسے بچ سکتا تھا جن کی نگاہیں دنیا کی ان دو عظیم ترین سلطنتوں کی جنگ کے نتیجے پر لگی ہوئی تھیں۔ خصوصاً قریش اس سے کیسے ناواقف ہو سکتے تھے جبکہ سورۂ روم کے نازل ہونے پر اسی جنگ روم و ایران کے معاملہ میں حضرت ابوبکر اور سردارانِ قریش کے درمیان باقاعدہ شرط لگ چکی تھی ؟

یہاں تک جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اہلِ عرب کے نہایت قریبی تعلقات مشرق اوسط کی معاشی و تمدنی اور سیاسی زندگی کے ساتھ قدیم ترین زمانے سے وابستہ رہے ہیں، اور اس خطۂ زمین میں ڈھائی ہزار سال سے تجارتی، صنعتی، زرعی اور ریاستی اغراض کے لیے قرض کے لین دین اور اس پر سود وصول کرنے کا رواج رہا ہے اور اہلِ عرب کا اس رواجِ عام سے بے خبر اور غیر متأثر رہنا قطعاً قابلِ تصور نہیں ہے۔

اب خود عرب کے مالی معاملات کو دیکھیے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تھے میں پہلے یہ بتا چکا ہوں کہ عرب کی ضروریات کے لیے غلّہ اور شراب زیادہ تر یہودی درآمد کرتے تھے اور باقی دوسرا سامان زیادہ تر مکہ اور طائف کے تاجر بیرونی علاقوں سے لاتے تھے میں یہ بھی عرض کر چکا ہوں کہ قریش اور ثقیف اور یہود کا یہ سارا کاروبار تھوک فروشی کی حد تک تھا اندرونِ ملک میں خردہ فروشی دوسرے لوگ کرتے تھے اور وہ ان تھوک فروشوں سے مال خرید کر لے جایا کرتے تھے میں یہ بھی بتا چکا ہوں کہ تھوک فروشوں اور خردہ فروشوں کے درمیان بالکل نقد انقد کی شرط پر کاروبار دنیا میں کبھی کہیں نہیں رہا ہے اور عرب میں بھی نہیں تھا۔ اس کے بعد ذرا اُن روایات کو ملاحظہ فرمائیے جو آیت ربٰو کی تفسیر میں عہدِ رسالت سے قریب زمانہ کے مفسرین سے منقول ہوئی ہیں ضحاک ذَرُوا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا کی تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

کان ربًا یتبایعون به فی الجاھلیة[1]	یہ وہ سود تھا جس کے ساتھ جاہلیت میں لوگ خرید و فروخت کرتے تھے۔

قتادہ کہتے ہیں:

ان ربا اھل الجاھلیة یبیع الرجل البیع الی اجل مسمی فاذا حل الاجل ولم یکن عند صاحبه قضاء زادہ واخر عنه[2]	اہلِ جاہلیت کا ربا یہ تھا کہ ایک شخص دوسرے شخص کے ہاتھ مال فروخت کرتا اور قیمت ادا کرنے کے لیے ایک مدت طے ہو جاتی۔ اب اگر وہ مدت پوری ہوگئی اور خریدار کے پاس اتنا مال نہ ہوا کہ قیمت ادا کرے تو بیچنے والا اس پر زائد رقم عائد کر دیتا اور مہلت بڑھا دیتا۔

سُدّی کہتے ہیں:

نزلت ھذہ الآیة فی العباس بن عبد المطلب ورجل من بنی المغیرة کانا شریکین فی الجاھلیة سلفا فی الربا الی اناس من ثقیف من بنی عمرو وجاء الاسلام ولھما اموال عظیمة فی الربا[3]	آیت وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا عباس بن عبد المطلب اور بنی المغیرہ کے ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ دونوں جاہلیت کے زمانے میں شریک تھے اور انھوں نے ثقیف کے بنی عمرو میں لوگوں کو سودی قرض پر مال دے رکھے تھے۔ جب اسلام آیا تو ان دونوں کا بڑا سرمایہ سُود میں لگا ہوا تھا۔

یہ سب روایات خُردہ فروشوں کے ہاتھ اُدھار پر مال فروخت کرنے اور اس پر سود لگانے کی خبر دیتی ہیں، اور یہ بھی بتاتی ہیں کہ اس تجارتی سود کے لیے بھی الربا کی اصطلاح ہی

---

[1] ابن جریر، ج ۳، ص ۷۱۔ [2] ایضاً، ص ۶۷۔

[3] " "، ص ۷۱۔

استعمال ہوتی تھی، کوئی دوسرا لفظ ایسا نہ تھا جو تجارتی قرضوں کے لیے مستعمل ہو اور الربا صرف ان قرضوں کے سود پر بولا جاتا ہو جو خالص شخصی حاجات کے لیے حاصل کیے جاتے تھے۔

پھر بخاری میں سات مقامات پر[1] اور نسائی میں[2] ایک مقام پر صحیح سندوں کے ساتھ یہ روایت نقل ہوئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا: بنی اسرائیل میں سے ایک شخص نے دوسرے شخص سے تجارت کے لیے ایک ہزار دینار قرض لیے اور کہا کہ میرے اور تیرے درمیان اللہ گواہ اور اللہ ہی کفیل ہے۔ پھر وہ بحری سفر پر چلا گیا۔ وہاں جب وہ اپنے کاروبار سے فارغ ہوا تو واپسی کے لیے اسے کوئی جہاز نہ ملا اور وہ مدت پوری ہو گئی جس کی قرارداد کر کے اس نے قرض لیا تھا۔ آخر اس نے یہ کیا کہ ایک لکڑی کے اندر سوراخ کر کے ایک ہزار دینار اس میں رکھ دیے اور قرض خواہ کے نام ایک خط بھی لکھ کر ساتھ رکھا اور سوراخ بند کر کے لکڑی سمندر میں چھوڑ دی اور اللہ سے دعا کی کہ میں نے تجھی کو گواہ اور کفیل بنا کر یہ رقم اس شخص سے قرض لی تھی، اب تو ہی اسے اس تک پہنچا دے۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ قرض خواہ ایک روز اپنے ملک میں سمندر کے کنارے کھڑا تھا، یکایک لکڑی کا ایک لٹھا اس کے سامنے آکر رکا۔ اس نے لکڑی کو اٹھا کر دیکھا تو قرضدار کا خط بھی اسے ملا اور ایک ہزار دینار بھی مل گئے۔

یہ روایت اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ تجارت کے لیے قرض لینے کا تخیل اس وقت عربوں میں غیر معروف نہ تھا۔

ابن ماجہ[3] اور نسائی[4] میں روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ حنین کے موقع پر عبداللہ بن ربیعہ مخزومی سے ۳۰ یا ۴۰ ہزار درہم قرض لیے تھے اور جنگ سے واپسی پر یہ قرض آپ نے ادا فرمایا۔ یہ ریاستی اغراض کے لیے قرض کی صریح مثال ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب الزکوٰۃ (باب ما یستخرج من البحر)، کتاب الشروط، کتاب الاستقراض، کتاب الکفالہ، کتاب اللقطہ، کتاب الاستیذان، اور کتاب البیوع (باب التجارۃ فی البحر)۔

[2] نسائی، کتاب اللقطہ [3] ابواب التجارات، باب حسن القضاء [4] کتاب البیوع، باب الاستقراض

ایک دوست نے دو اور واقعات کی طرف بھی مجھے توجہ دلائی ہے جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ پہلا واقعہ ہند بنت عُتبہ کا ہے کہ اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بیت المال کا چار ہزار روپیہ (غالباً درہم) تجارت کے لیے قرض حاصل کیا تھا۔[1]

دوسرا واقعہ بھی حضرت عمرؓ ہی کے عہد کا ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری (بصرہ کے گورنر) نے بیت المال کا روپیہ حضرت عمرؓ کے دو صاحبزادوں، عبداللہ اور عبیداللہ کو تجارت کے لیے قرض دیا۔ مگر بعد میں حضرت عمرؓ نے اس قرض کو قابلِ اعتراض قرار دیکر اصل کے علاوہ پورے منافعہ کا بھی اپنے صاحبزادوں سے مطالبہ کیا، اور آخر کار لوگوں کے مشورے سے اس کو قرض کے بجائے قراض (مضاربت) قرار دے کر آدھا منافعہ وصول کیا۔[2]

یہ دونوں مثالیں زمانۂ جاہلیت سے بہت قریب کے دَور کی ہیں۔ عرب میں سنہ ۹ ھ تک سودی کاروبار چلتا رہا ہے۔ یہ واقعات اس کی آخری بندش سے صرف دس بارہ سال بعد کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اتنی قلیل مدت میں تصورات نہیں بدل جاتے ہیں۔ اس لیے ان واقعات سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ قرض پر سرمایہ لیکر تجارت کرنے کا تصور عہدِ جاہلیت میں بھی موجود تھا۔

رہی یہ بات کہ اسلامی عہد کے مؤرخین اور محدثین و مفسرین نے شخصی حاجات اور تجارتی و کاروباری قرضوں کا واضح طور پر الگ الگ کیوں ذکر نہ کیا، تو اس کا ظاہر سبب یہ ہے کہ ان کے ہاں قرض، خواہ جس غرض کے لیے بھی ہو، قرض ہی سمجھا جاتا تھا اور اس پر سُود کی حیثیت بھی ان کی نگاہ میں یکساں تھی۔ انہوں نے نہ اس تصریح کی کوئی خاص ضرورت محسوس کی کہ بھوکے مرتے ہوئے لوگ پیٹ بھرنے کے لیے قرض لیتے تھے، اور نہ خاص طور پر اسی بات کو تفصیل سے بیان کرنا ضروری سمجھا کہ کاروبار کے لیے لوگ قرض لیا کرتے تھے۔ ان امور کی تفصیلات خال خال ہی کہیں ملتی ہیں جن سے صحیح صورتِ حال سمجھنے کے لیے عرب کے حالات کو اس وقت کی دنیا کے مجموعی

---

[1] تاریخ طبری، بسلسلۂ واقعات سنہ ۲۳ھ، عنوان: شیءٌ من سیرہ مما لم یمض ذکرہ۔

[2] مؤطا: کتاب القراض۔

حالات میں رکھ کر دیکھنا ناگزیر ہے۔ مختلف قرضوں کے درمیان اُن کی اغراض کے لحاظ سے فرق و امتیاز کر کے ایک مقصد کے قرض پر سود کو جائز اور دوسرے مقصد کے قرض پر اس کو ناجائز ٹھیرانے کا تخیل غالباً چودھویں صدی عیسوی سے پہلے دنیا میں نہ پایا جاتا تھا۔[۱] اُس وقت تک یہودیت، مسیحیت اور اسلام کے تمام اہلِ دین اور اسی طرح اخلاقیات کے ائمہ بھی اس بات پر متفق تھے کہ ہر قسم کے قرضوں پر سود ناجائز ہے۔

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ زمانۂ قبل اسلام میں یہ ممکن ہی نہ تھا کہ لوگ قرض کے سرمایہ سے تجارت کر سکیں، کیونکہ ملک میں کوئی باقاعدہ حکومت نہ تھی۔ ہر طرف بدامنی پھیلی ہوئی تھی، تجارتی قافلوں کو بہت بھاری ٹیکس دے دے کر مختلف قبائل کے علاقوں سے گزرنا پڑتا تھا اور اِن پُرخطر حالات کی وجہ سے شرح سود تین چار سو فیصدی تک پہنچی ہوتی تھی جس پر قرض لے کر کاروبار میں لگانا کسی طرح نفع بخش نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ قیاس آرائی اصل تاریخی حالات سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی۔ یہ محض ایک مفروضہ ہے جو تاریخ سے بے نیاز ہو کر صرف اِس گمان پر قائم کر لیا گیا ہے کہ عرب میں جب کوئی باقاعدہ حکومت نہ تھی اور عام بدامنی پھیلی ہوئی تھی تو ضرور اس کے نتائج یہی ہونگے۔ حالانکہ تاریخی واقعات یہ بتاتے ہیں کہ اسلام سے قریب کے عہد میں ایران و روم کی پیہم لڑائیوں اور سیاسی کشمکش کی بدولت چین، انڈونیشیا، ہندوستان اور مشرقی افریقہ کے ساتھ رومی دنیا کے جتنے بھی تجارتی تعلقات تھے ان کا واسطہ مکہ کے عرب تاجر ہی تھے۔ مشرق کا سارا مالِ تجارت خلیج فارس اور بحرِ عرب کے بندرگاہوں پر اترتا اور وہاں سے مکہ پہنچ کر رومی دنیا میں جاتا تھا۔ اور اسی طرح رومی دنیا کے سارے اموالِ تجارت قریش ہی کے قافلے مکہ لاتے اور پھر ان بندرگاہوں تک پہنچاتے تھے جن پر مشرق کے تاجر آیا کرتے تھے۔ اولیاری لکھتا ہے کہ اس زمانہ میں مکہ بینک کاری کا مرکز بن گیا تھا جہاں دور دراز علاقوں کے لیے ادائیگیاں کی جا سکتی تھیں، اور وہ بین الاقوامی

۱۔ Henry Pirenne, Economic and Social History of Medieval Europe, (English Translation), 4 Edition, Butler, London, 1949, P. 140

تجارت کا گھر بنا ہوا تھا۔[1]

(MECCA HAD BECOME A BANKING CENTRE WHERE PAYMENTS COULD BE MADE TO MANY DISTANT LANDS, AND A CLEARING HOUSE OF INTERNATIONAL COMMERCE)

یہ چمکتی ہوئی تجارت آخر کیسے چل سکتی تھی اگر حالات وہ ہوتے جو فرض کیے گئے ہیں معاشی قوانین کی سرسری واقفیت بھی یہ سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ جہاں بد امنی کی وجہ سے کاروبار اس قدر کثیر المصارف اور پُر خطر ہو کہ تجارتی سُود کی شرح تین چار سو فی صدی تک پہنچ جاتے وہاں لازماً مالِ تجارت کی لاگت (COST PRICE) بھی اس حد تک بڑھ جانی چاہیے کہ بیرونی منڈیوں میں لے جا کر انہیں منافع کے ساتھ فروخت کرنا غیر ممکن ہو جائے۔ آخر اتنی چڑھی ہوئی قیمتوں پر یہ مال مصر و شام کے بازاروں میں کیسے بک جاتا تھا؟ دراصل عرب میں اُس ساری بد امنی و بد نظمی کے باوجود جس کا ذکر کیا جاتا ہے، بڑے پیمانے کی تجارت وہ قبیلے کرتے تھے جو بجائے خود طاقت ور ہوتے تھے، بڑے بڑے قبیلوں سے جنہوں نے حلیفانہ معاہدات بھی کر رکھے تھے، سود پر لاکھوں روپے کا مال قبیلوں میں پھیلا کر بھی جنہوں نے بکثرت لوگوں کو اپنے کاروبار کی گرفت میں لے لیا تھا، اور سردارانِ قبائل کو ہر طرح کے سامانِ تعیش بہم پہنچا کر بھی جنہوں نے اپنے وسیع اثرات قائم کر لیے تھے۔ اس کے علاوہ خود قبائل کا اپنا مفاد بھی اس کا متقاضی تھا کہ ان کو وہ ناگزیر ضروریاتِ زندگی، غلہ کپڑا وغیرہ بہم پہنچیں جو باہر سے درآمد ہوتی تھیں۔ اس وجہ سے ان طاقتور قبیلوں کو بڑے بڑے تجارتی قافلے لے کر، جن میں بسا اوقات ڈھائی ڈھائی ہزار اونٹ ہوتے تھے، عرب کے راستوں سے گزرنے کے لیے اس قدر بھاری ٹیکس نہیں دینے پڑتے تھے، اور نہ خطرات سے محفوظ رہنے کے لیے اس قدر خطیر مصارف اٹھانے پڑتے تھے کہ اموالِ تجارت کی قیمتیں ناقابلِ فروخت حد تک چڑھ جائیں۔ بیرونی تجارت کے علاوہ خود عرب کے مختلف حصوں میں سال کے سال تقریباً ۲۰ مرکزی مقامات پر باقاعدہ ہاٹ (سوق) لگتے تھے جن کا ذکر

[1] ARABIA BEFORE MOHAMMAD, P. 162

ہمیں تاریخوں میں ملتا ہے۔ ان ہاٹوں میں عرب کے ہر ہر حصے سے قافلے آکر خرید و فروخت کرتے اور ان میں سے بعض میں روم و ایران اور چین و ہندوستان تک کے تاجر آیا کرتے تھے۔ یہ پیہم تجارتی نقل و حرکت آخر کیسے جاری رہ سکتی تھی اگر عرب کے حالات اتنے ہی خراب ہوتے جتنے فرض کر لیے گئے ہیں۔ مؤرخین نے قریش کے تجارتی کاروبار کے متعلق یہ تصریح کی ہے کہ وہ سو فیصدی منافع کمایا کرتے تھے[1] ایسے منافعہ کے کاروبار کے لیے سودی قرض پر سرمایہ نہ مل سکنا۔ اور شرح سود تین چار فیصدی تک ہونا قطعاً خارج از فہم ہے۔ اور اس دعوے کے لیے کوئی تاریخی سند موجود نہیں ہے کہ عرب میں شرح سود اس قدر بڑھی ہوئی تھی۔ (باقی)

(بقیہ آئین کمیشن کا سوالنامہ) پر پیطے ہونا چاہیے کہ مملکت کے قانون کا اولین ماخذ قرآن اور سنت ہونگے

۲۔ صدر مملکت کا انتخاب دستور نافذ ہونے کے بعد از سر نو ہونا چاہیے۔

۳۔ ملک کے دستور میں لازماً ان امور کی صراحت ہونی چاہیے کہ:

(الف) ملک میں مارشل لا صدر مملکت کے باقاعدہ اعلان کے ذریعہ سے صرف اُن حالات میں لگایا جائیگا جبکہ ملک میں کھلی بغاوت رونما ہو اور سول گورنمنٹ اسے رفع کرنے میں ناکام ہو جائے، یا جبکہ حالتِ جنگ میں دفاعی اغراض کے لیے اس کی ضرورت ہو۔

(ب) مارشل لا صرف اس وقت تک نافذ رہ سکے گا جبتک دیوانی حکومت انتظام سنبھالنے کے قابل ہو جائے۔

(ج) مارشل لا کے حکام کا فرض قیام امن سے زائد کچھ نہ ہو گا۔

(د) مارشل لا کے حکام کسی غیر فوجی آدمی پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلانے کے مجاز نہ ہونگے (یا کم از کم یہ کہ صرف ایسے لوگوں پر فوجی عدالتوں میں مقدمہ چلایا جاسکے گا جو بالفعل مسلح مزاحمت کرتے ہوئے، یا حملہ آور دشمن سے عملاً تعاون کرتے ہوئے گرفتار ہوں)

(ھ) مارشل لا کے احکام کا اطلاق کسی حالت میں مارشل لا سے پہلے کے افعال پر نہ ہو سکے گا۔

(و) کسی انڈمنٹی ایکٹ میں مارشل لا کے حکام کو صرف اُن افعال سے بری الذمہ کرنے کی گنجائش رکھی جائیگی جو نیک نیتی کے ساتھ کیے گئے ہوں اور ان کا ارتکاب قیام امن کی ضرورت کے لیے ناگزیر ہو۔

(ز) مارشل لا کے بعد سزاؤں اور ضبطیوں وغیرہ کے احکام کے خلاف لوگوں کو سپریم کورٹ میں اپیل کرنیکا حق ہو گا۔

ہماری یہ تجاویز نہ صرف انصاف کے معروف اصولوں پر مبنی ہیں، بلکہ ہم معزز ارکانِ کمیشن کو توجہ دلائیں گے کہ وہ براہِ کرم ۱۸۰۴ء کا ریگولیشن ۱۰، اور وہ ہدایات جو مارشل لا کے سلسلے میں لارڈ ولزلی نے دی تھیں، اور وہ قوانینِ براءت (INDEMNITY ACTS) جو انگریزی دورِ حکومت میں وقتاً فوقتاً پاس کیے گئے تھے، بغور ملاحظہ فرمائیں۔ اس تقابل سے انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہماری یہ تجاویز اس انصاف کے حدود سے ذرہ برابر متجاوز نہیں ہیں جسے ایک غیر قوم اس ملک پر حکومت کرنے میں ملحوظ رکھتی تھی۔